بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

سلسلہ مباحث

"اسلامی ریاست"

(مبحث سوم)

غیر مسلموں کے حقوق

(از مولانا امین احسن صاحب اصلاحی)

غیر مسلموں سے متعلق دو بنیادی سوال

ایک اسلامی حکومت کے اندر غیر مسلم رعایا کے حقوق کو ٹھیک ٹھیک متعین کرنے میں، دو باتوں کی وجہ سے، اکثر لوگوں کو بڑی الجھنیں پیش آتی ہیں۔ ایک یہ کہ لوگ عام طور پر اسباب کو نہیں جانتے کہ آیا سب غیر مسلموں کے متعلق شریعت اسلامی کے احکام بلا امتیاز ایک ہی ہیں یا اُن کے مختلف گروہوں کے متعلق شریعت کے احکام میں فرق ہے اور اگر کچھ فرق ہے تو وہ کیا اور کس بنیاد پر ہے؟ دوسری یہ کہ لوگ اس امر سے بھی بالعموم ناواقف ہیں کہ آیا اسلامی حکومت کے تحت غیر مسلم رعایا کی بس ایک ہی قسم ہے جن کو عام طور پر "ذمی" کہتے ہیں اور جن کے حقوق حدیث و فقہ کی مختلف کتابوں میں اہل ذمہ کے حقوق کے سلسلہ میں بیان ہوتے ہیں، یا ان معروف اہل ذمہ کے علاوہ اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا کی کوئی اور قسم بھی ہے جن کے حقوق ان معروف اہل ذمہ کے متعین حقوق سے کچھ مختلف ہیں یا اُن سے مختلف ہو سکتے ہیں؟ ان دو سوالوں کو ٹھیک ٹھیک نہ سمجھنے کی وجہ سے غیر مسلموں کے حقوق کے تعین میں پہلے بھی بہت کچھ افراط و تفریط ہوتی رہی ہے اور اب بھی اس کا اندیشہ ہے اس وجہ سے میں حقوق کی بحث سے پہلے ان دونوں سوالوں کو صاف کرنے کی کوشش کروں گا۔ ان کے صاف ہو جانے کے بعد انشاءاللہ اصل مسئلہ پر غور کرنے کے لئے صحیح راہ خود بخود کھل جائے گی۔

پہلے سوال کا جواب قرآن مجید اور احادیث کی روشنی میں غور کرنے سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ شریعت الٰہی نے اُن غیر مسلموں میں جن پر براہ راست کسی رسول کے ذریعہ سے خدا نے اپنے دین کی حجت تمام فرمائی ہے، اور اُن غیر مسلموں میں، جن پر کسی رسول کے ذریعہ سے براہ راست نہیں بلکہ بالواسطہ حجت تمام کی گئی ہے، فرق کیا ہے۔ جہاں تک اس دنیا میں ان کے ساتھ معاملہ کرنے کا تعلق ہے دونوں گروہوں کے ساتھ کبھی ایک سا معاملہ نہیں کیا گیا ہے[1]۔ قرآن مجید میں مختلف انبیاء (علیہم السلام) کی اپنی قوموں کے مشرکین کے ساتھ کشمکش کے جو واقعات بیان ہوتے ہیں ان سے یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ غیر مسلموں کے ان دونوں گروہوں میں سے پہلے کے بارہ میں خدائی دستور یہ رہا ہے کہ جب کسی قوم پر اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی رسول کے ذریعہ سے حق واضح کر دیا ہے اور تبلیغ و دعوت کی جو شرطیں ایک رسول کے لئے اس کے ہاں مقرر ہیں وہ پوری ہو چکی ہیں

[1] جن لوگوں کی نگاہ اس فرق پر یا اس کے اسباب پر نہیں ہے ان کو غیر مسلموں سے متعلق اسلام کے مختلف قسم کے احکام سمجھنے میں بڑی الجھنیں پیش آئی ہیں۔ ان میں سے ایک بڑا گروہ تو ان لوگوں کا ہے جو یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ بہت سے شرعی احکام مشرکین بنی اسمٰعیل (یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کے مشرکین عرب جو حضور کے مخاطب اول تھے) کے لئے خاص ہیں لیکن چونکہ ان کو اس خصوصیت کی وجہ نہیں معلوم ہے اس وجہ سے بسا اوقات وہ بعض باتوں کی نہایت غلط اور مہمل توجیہیں بیان کرتے ہیں جو بات کو صاف کرنے کے بجائے اور زیادہ الجھا دیتی ہیں۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو بنی اسمٰعیل اور غیر بنی اسمٰعیل (مثلاً یہود و نصاریٰ اور مجوس وغیرہ) کے فرق ہی سے سرے سے ناواقف ہیں۔ یہ حضرات بعض اوقات تو بالکل غضب ہی ڈھا دیتے ہیں۔ ان میں سے جن کی طبیعت پر تشدد پسندی کا غلبہ ہے وہ بنی اسمٰعیل سے متعلق مخصوص احکام کی بنا پر بعض اوقات عام غیر مسلموں پر ایسے فتوے جڑ دیتے ہیں جن کی ذمہ داری ہرگز اسلام پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ اور جن حضرات کی طبیعت پر رواداری اور "روشن خیالی" کا غلبہ ہے وہ غیر مسلموں کے مسائل پر بحث کرتے ہوئے یا تو اپنے جوش رواداری میں ان احکام کو اپنے رجحان طبیعت کے خلاف پا کر بالکل ہی نظر انداز کر جاتے ہیں یا پھر ان کی ایسی فضول تاویلیں کرتے ہیں کہ معاملہ اور بھی پیچیدہ ہو کے رہ جاتا ہے۔ حیرت یہ ہے کہ اس معاملہ میں علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ جیسے صاحب نظر عالم سے لغزش ہوئی جن کی لغزش بہتوں کی لغزش کا سبب ہو سکتی ہے۔

تو اس کے بعد اُس قوم کے کفار و مشرکین (غیر مسلموں) کو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جینے کی مزید مہلت نہیں دی ہے۔ ایسے لوگوں کو پھر لازماً مٹا دیا گیا ہے اور ان کی تباہی کے لئے حسب حالات مندرجہ ذیل دو صورتوں میں سے ایک صورت نمودار ہوتی ہے:-

(۱) اگر اُس قوم کی اکثریت، اتمام حجت کے باوجود دعوتِ حق کے انکار اور اسکی مخالفت پر جمی رہ گئی ہے اور صرف گنتی کے چند نفوس ہی اُس کے اندر سے حق کا ساتھ دینے والے نکلے ہیں تو اُسے "اسلام[1] یا عذاب الٰہی؟" میں سے (جسے وہ پسند کرے) ایک کے انتخاب کا حکم دے دیا گیا ہے اور اگر اس نے اسلام کی جگہ عذاب الٰہی ہی کو اختیار کیا ہے تو زمین یا آسمان سے کسی عذاب الٰہی نے نمودار ہو کر ان کو فنا کر دیا ہے چنانچہ نوح، ہود، صالح، لوط، شعیب علیہم السلام کی قوموں کے ساتھ، جن کی سرگذشتیں قرآن میں بیان ہوئی ہیں یہی صورت پیش آئی۔

(۲) اور اگر اُس قوم میں سے ایک معتدبہ حصہ حق (رسول) کا ساتھ دینے والوں کا بھی نکل آیا ہے تو اس صورت میں لازماً اہل حق اور اہل باطل کے درمیان کشمکش برپا ہوئی ہے اور اتمام حجت کے سارے مراحل طے ہو جانے کے بعد بھی ان میں سے جو لوگ ایمان نہیں لائے ہیں انہیں اہل حق کی طرف سے "اسلام یا تلوار؟" میں سے (جسے وہ پسند کریں) ایک کو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اگر انہوں نے اسلام کے بجائے تلوار ہی کو منتخب کیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی تلوار سے ہی۔۔۔ ان کو صفحۂ ہستی سے محو کر دیا ہے[2]۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین عرب کے درمیان جو صورت پیش آئی وہ یہی دوسری صورت تھی مسلسل بیس برس تک انتہائی محنت و دلسوزی سے رات دن سمجھانے اور ہر ممکن طریقہ سے حق کو واضح کرنے کی کوشش کے بعد بھی جب عرب کے کچھ لوگ قبول حق کے لئے آمادہ نہ ہوئے بلکہ الٹے دوسروں کو بھی اُس سے منحرف کرنے پر برابر کمربستہ رہے تو آخر کار رسول کو حکم دے دیا گیا کہ اب یہ لوگ عرب کے اندر

---

[1] یعنی اپنے اور اس کائنات کے خالق و مالک اور رب کی بے آمیز اطاعت و بندگی۔

[2] اہل حق کی تلوار بھی دراصل خدائی تازیانوں میں سے ایک تازیانہ ہے کیونکہ خدا کا رسول جو کچھ بھی کرتا ہے براہ راست اللہ تعالیٰ کی ہدایت و رہنمائی میں کرتا ہے۔

کہیں پناہ نہ پائیں، ان کے ساتھ ہر قسم کے تعلقات منقطع کر لو، ان میں سے جن کے ساتھ کوئی معاہدہ ہے اسکی مدت ختم ہونے کے بعد اسکی تجدید نہ ہو، اب ان سے مصالحت ورواداری کا کوئی سوال باقی نہیں رہا۔ امان کے چار مہینوں کے گذر جانے کے بعد ان کے سامنے "اسلام اور تلوار" دو چیزیں رکھدو اور ان کو اختیار دے دو کہ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیں۔ اگر یہ تلوار کا انتخاب کریں تو پھر ان کو جہاں پاؤ قتل کرو اور اس وقت تک امان نہ دو جب تک یہ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار نہ کریں، نماز نہ قائم کریں اور زکوٰۃ نہ ادا کریں۔ چنانچہ سورۃ برأۃ میں یہ احکام نازل ہونے کے بعد ہی حج کے موقعہ پر تمام ملک میں ان احکام کا اعلان کر دیا گیا اور مہلت کی مدت گذرنے کے بعد ان تمام مشرکین کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا جن کے معاہدے ختم ہو چکے تھے۔

لیکن یہ احکام اور یہ معاملہ، جیسا کہ اوپر بیان میں واضح کیا جا چکا ہے مشرکین بنی اسمٰعیل یا مشرکین عرب کے لئے خاص[۱] تھے اور اس خصوص کی وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے خاص انہی کے اندر سے ایک نبی مبعوث فرما کر اپنی حجت ان پر براہ راست تمام کر دی تھی۔ باقی رہے دوسرے عام غیر مسلم جن پر دین حق کی حجت بالواسطہ پوری کی گئی ہے اور جن کو اتمام حجت کے پہلو سے وہ امتیازات حاصل نہیں رہے ہیں جو خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کو حاصل رہے ہیں ان کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کیا گیا[۲] بلکہ ان

[۱] جو لوگ اس مسئلہ کو تفصیل کے ساتھ دیکھنا اور سمجھنا چاہتے ہوں کہ ایک نبی کے مخاطب غیر مسلموں سے یہ نہایت درجہ سخت معاملہ کیوں کیا جاتا ہے انہیں ہماری کتاب "حقیقت شرک" کی فصل ۳ "کیا شرک تقاضائے فطرت ہے؟" دیکھنی چاہیئے۔ یہاں اسکی تفصیل کے لئے نہ تو موقعہ اور گنجائش ہی ہیں اور نہ یہ بحث اس مضمون سے متعلق ہے۔

[۲] غیر مسلموں کے ان دونوں گروہوں کے اس فرق کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ جو لوگ ان دونوں گروہوں کے اس فرق کو اور اس فرق کی علت کو پوری طرح نہیں سمجھتے ہیں ان کے لئے غیر مسلموں کے بارہ میں اسلامی حکومت کی اصلی پالیسی کو سمجھنا ناممکن ہے۔ جن لوگوں نے اس فرق اور اسکی علت کو سمجھے بغیر اس مسئلہ پر قلم اٹھایا ہے وہ نہ تو خود اپنے دل کے شبہات دور کر سکے ہیں اور نہ غیر مسلموں کے سامنے اسلام کی اصلی پالیسی کی وضاحت کر سکے ہیں بلکہ وہ اپنی کتابوں اور اپنے مضامین میں اس سوال پر بحث کرتے ہوئے ایسے خلا چھوڑ گئے ہیں کہ ان کو پڑھ کر مسلمان بھی الجھن[۳]

[۳] میں مبتلا ہوتے ہیں اور غیر مسلموں کے دل کی کھٹک بھی دور ہونے کے بجائے اور زیادہ بڑھ جاتی ہے اور وہ اس سارے ادعا

کو خواہ وہ کسی مذہب کے پیرو رہے ہوں اہل کتاب یا مشابہ اہل کتاب قرار دیا گیا اور ان کو اسلامی نظام کے تحت خاص مراعات دی گئیں جن کی تفصیل آگے بیان ہوگی۔

ان میں سے جو اسلام کی اصطلاح کے لحاظ سے صریحی اہل کتاب تھے مثلاً یہودی اور عیسائی، وہ تو بہرحال اس سلوک کے مستحق تھے ہی کیونکہ خود قرآن ہی نے ان کو بنی اسمٰعیل کے بالمقابل ایک امتیازی سلوک کا مستحق قرار دے دیا تھا اور ان سے متعلق ساری پالیسی پوری تفصیل کے ساتھ عہد رسالت ہی میں طے پا چکی تھی۔ باقی جو صریحی اہل کتاب نہیں تھے مثلاً مجوسی، جب وہ اسلامی حکومت کے زیر اقتدار آئے اور ان کے ساتھ معاملہ کرنے کا سوال سامنے آیا تو خود پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم ہی کے ایک ارشاد نے اس مسئلہ کو بھی طے کر دیا اور ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا گیا جو اہل کتاب کے ساتھ کیا گیا۔ اس کے بعد صابئین اور بربروں کا مسئلہ سامنے آیا اور باتفاق صحابہ و علماءؒ وہ بھی اسی درجہ میں رکھے گئے یہاں تک کہ پوری امت کے اجماع و اتفاق سے یہ بات طے ہو گئی کہ عجم کے تمام غیر مسلم خواہ ان کی عملی اور اعتقادی گمراہیوں کی نوعیت کچھ ہو، جب وہ اسلامی حکومت کی ماتحتی میں آئیں گے تو ان کا سیاسی درجہ وہی ہوگا جو قرآن نے اہل کتاب کو دیا ہے۔ جو اہل کتاب ہیں ان کو یہ درجہ اس لئے حاصل ہوگا کہ اسلامی قانون کی رو سے وہ اس درجہ کے ازروئے نص حقدار ہیں۔ اور جو اہل کتاب نہیں ہیں وہ اس وجہ سے اس درجہ کے مستحق قرار پائیں گے کہ وہ مشابہ اہل کتاب ہیں۔ اہل کتاب اور شبہ اہل کتاب میں اگر کوئی فرق کیا گیا ہے تو صرف اُس دائرہ کے اندر کیا گیا ہے جو اُن کے ذبیحہ کے کھانے اور نہ کھانے اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنے اور نہ کرنے سے متعلق ہے۔ ان کے سیاسی اور مدنی حقوق میں کوئی فرق نہیں کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے ایک عیسائی، ایک ہندو اور ایک پارسی سب برابر ہیں[لہ]۔

لہ ہر چند اس معاملہ میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ امام احمد اور شافعی کے نزدیک اس رعایتی سلوک کے مستحق صرف تین گروہ ہیں:- یہود، نصاریٰ اور مجوس، دوسرے غیر مسلم ان کے نزدیک اس رعایت کے مستحق نہیں ہیں۔ لیکن یہ اختلاف صرف رائے کا اختلاف ہے عمل کا اختلاف نہیں ہے۔ شروع سے لے کر اسلامی حکومت کے دور آخر تک جن لوگوں کے ہاتھ میں اسلامی سیاست کی باگ رہی ہے ان کا عمل اسی مسلک پر رہا ہے جو میں بیان کر رہا ہوں۔

دوسرے سوال کا جواب | مشرکین عرب کے خاص معاملہ اور ان سے متعلق خاص احکام کو دنیا کے دوسرے عام غیر مسلموں کے معاملات اور احکام سے الگ کر دینے کے بعد اب دوسرے سوال کو لیجئے۔

”اسلامی“ تاریخ اور حدیث و فقہ کی روشنی میں اس سوال پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کے تحت غیر مسلم رعایا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اہل صلح یا معاہد، دوسرے اہل عنوہ۔ فقہ کی کتابوں میں چونکہ عام طور پر ان سب کے لئے ایک ہی جامع لفظ ”اہل ذمہ“ کا استعمال کیا جاتا ہے اس وجہ سے اسلامی حکومت کی دونوں قسم کی غیر مسلم رعایا کے لئے یہی اصطلاح چل پڑی ہے اور لوگ عام طور پر اسی سے واقف ہیں۔ لیکن چونکہ معاہد اور اہل عنوہ دونوں کی قانونی اور عرفی حیثیتوں میں بڑا فرق ہے اس وجہ سے ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔

”اہل صلح یا معاہد“ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلامی حکومت سے شکست کھانے سے پہلے اس کے اقتدار سے مرعوب ہو کر یا اس کی اخلاقی و سیاسی برتری سے متاثر ہو کر یا اپنے مصالح و مفاد کو پیش نظر رکھ کر، ایک معاہدہ کے تحت، اپنے آپ کو اس کی ماتحتی میں دے دیا ہو۔ رعیت ہونے کی حیثیت سے تو یہ اور اہل عنوہ (معروف اہل ذمہ) دونوں برابر ہیں لیکن ان کے حقوق کا فیصلہ تنہا اسلامی حکومت نہیں کرتی بلکہ وہ معاہدہ کرتا ہے جو ان کے اور اسلامی حکومت کے درمیان طے پا جاتا ہے۔

”اہل عنوہ“ (Conquered Subjects) سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے ”اسلام“ کے خلاف جنگ کی ہو اور اس کی تلوار سے شکست کھانے کے بعد اسلامی حکومت کی اطاعت پر مجبور ہوتے ہوں یہ لوگ اسلامی حکومت کی مفتوح رعایا ہوتے ہیں۔ حکومت ان کے افراد پر جزیہ لگاتی ہے اور جو زمینیں ان کے زیر کاشت ہوتی ہیں ان پر ان سے خراج وصول کرتی ہے۔ ان کے حقوق بذریعہ قانون محفوظ کر دیئے گئے ہیں[1] جو شریعت اسلامی کا جز ہیں اور ایک اسلامی حکومت پر ان کی حفاظت اور ادائیگی اسی طرح واجب ہے جس طرح شریعت کے دوسرے احکام اور واجبات کی حفاظت ضروری ہے۔ اس مضمون میں ہم نے غلط بحث سے بچنے اور اصل مسئلہ کو بالکل منقح کرنے کی غرض سے ”اہل ذمہ“ یا ”مفتوح اہل ذمہ“ کی اصطلاح صرف اسی

[1] ان کے ان حقوق کی تفصیل آگے بیان ہوگی۔

نوع کی غیر مسلم رعایا کے لیئے استعمال کی ہے۔

یہ دونوں جماعتیں اپنے فرق مراتب کی تفصیلات اور اپنے الگ الگ ناموں اور خصوصیات کے ساتھ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں لیکن کہیں کہیں دونوں میں ایسا خلط مبحث سا ہوگیا ہے کہ ایک عام آدمی کے لیئے ان میں امتیاز کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ اس وجہ سے میں دونوں کی حیثیت اور ان کے حقوق کو یہاں الگ الگ بیان کروں گا تاکہ یہ خلط مبحث بالکل رفع ہوجائے اور دونوں میں جو فرق و امتیاز ہے وہ پوری طرح نمایاں ہوجائے۔

اہل صلح یا معاہد رعایا اور ان کے حقوق

ان کے حقوق کی بنیاد جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے صرف حکومت اسلامی کے کسی اعلان پر نہیں ہوتی بلکہ اُس معاہدہ پر ہوتی ہے جو ان کے اور اسلامی حکومت کے درمیان طے پا جاتا ہے۔ اس معاہدہ میں جو ذمہ داریاں انہوں نے اٹھائی ہیں وہ ان کے پابند ہیں اور جو ذمہ داریاں اسلامی حکومت نے اٹھائی ہیں وہ ان کے لیئے عنداللہ و عندالناس ذمہ دار ہے۔

اس اصولی بات کے سامنے آجانے کے بعد اگرچہ اہل صلح کا موقف اور درجہ بالکل متعین ہوجاتا ہے لیکن خود اسلامی حکومت کے متعلق یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ وہ اس طرح کے معاہدات میں کس حد تک غیر مسلم کو رعایات دے سکتی ہے۔ اس کا مجمل اور اصولی جواب تو یہ ہے کہ ان کو وہ تمام رعاتیں دی جا سکتی ہیں جو کسی نوعیت سے خدا کی حاکمیت اور شریعت اسلامی کے اصول پر اثر انداز نہ ہو رہی ہوں۔ لیکن ذہنوں کے اندر اس کا ایک واضح تصور پیدا کرنے کے لئے غالباً یہ مفید ہوگا کہ ہم یہاں چند ایسے معاہدے نقل کر دیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانوں میں اسلامی حکومت نے اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ کیئے ہیں۔ ان سے اچھی طرح اندازہ ہو سکیگا کہ یہ معاہدے کن حالات کے اندر ہوئے ہیں، کس طرح کے لوگوں سے ہوئے ہیں، کن مقاصد کے تحت ہوتے ہیں، اور ان کا دائرہ اور ان کی وسعت کس حد تک ہے اور آج کے حالات کے اندر ایک اسلامی حکومت ان سے اپنی غیر مسلم اقلیتوں کے مسائل حل کرنے میں کس حد تک

فائدہ اٹھا سکتی ہے۔

غیر مسلم رعایا کے ساتھ اسلامی حکومت کے معاہدے اس قسم کے معاہدے اسلامی تاریخ میں بہت سے ہیں خلفائے راشدین کے زمانہ ہی میں بہت سے مقامات اسلامی حکومت کے دائرہ اقتدار میں ایسے آچکے تھے جو بلاد الصلح ([illegible]) کے حکم میں داخل تھے مثلاً ہَجَر، بحرین، آیلہ، دُومۃ الجندل، اَذْرُح، بیت المقدس، دمشق، شام کے اکثر شہر (بلک کو مستثنیٰ کر کے)، بلادِ جزیرہ، مصر، خراسان (اکثر حصہ)۔ ان تمام مقامات کے باشندوں کے ساتھ اسلامی حکومت کے معاملات تمامتر معاہدات پر قائم تھے جن کی نسبت ابو عبید قاسم نے لکھا ہے کہ فھؤلاء علی شئ وظھم لا یحال بینھم وبینہا۔ (ان کے ساتھ اُن شرائط کے مطابق معاملہ کیا جائے گا جو ان کے ساتھ طے پا چکے ہیں، اس کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی جائے گی[1])۔ اگر ان میں سے تمام اہم معاہدات سامنے ہوں تو ان کی روشنی میں پوری تفصیل کے ساتھ اس پالیسی کی وضاحت کی جا سکتی ہے جو اسلامی حکومت نے 'اپنے بہترین دور میں' اہل صلح کے ساتھ اختیار کی ہے لیکن سر دست میرے پاس ضروری کتابیں موجود نہیں ہیں اس وجہ سے بحث کو مختصر رکھنا پڑا ہے اور بیشتر اسی مواد پر قناعت کرنی پڑی ہے جو قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج اور ابو عبید قاسم کی کتاب الاموال میں مل سکا ہے کیونکہ یہی دو کتابیں زیادہ تر میرے پیش نظر رہی ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے موقع دیا تو آئندہ اس میں حسب ضرورت اضافہ کر دیا جائے گا۔

اہل فَدَک کا معاہدہ اس سلسلہ میں ایک قابل ذکر معاہدہ اہل فدک کا ہے جس سے یہ قرار داد ہوئی تھی کہ:

ان لھم رقابھم ونصف ارضھم	"یہ لوگ آزاد ہوں گے اور اپنی نصف زمین اور اپنے
ونخلھم ولرسول اللہ صلی اللہ	آدھے نخلستان کے مالک رہیں گے اور
علیہ وسلم شطر ارضھم ونخلھم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اسلامی حکومت)

کے لئے ان کی زمین اور ان کے نخلستان کا آدھا حصہ ہو گا۔"

اس معاہدہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی جانوں کی آزادی کے ساتھ ساتھ ان کی آدھی

---

[1] کتاب الاموال صفحہ ۱۰۱

زمین اور ان کے آدھے نخلستان پر ان کا مالکانہ قبضہ بھی تسلیم کیا گیا تھا یعنی وہ اپنی زمین اور اپنے نخلستان پر ذمیوں کی طرح محض کاشتکار نہ قابض نہیں تھے بلکہ ان پر مالکانہ تصرف رکھتے تھے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں جب ان کو فدک سے نکالنا چاہا تو پہلے آدمی بھیجکر ان کے حصّہ کی زمین اور ان کے حصّہ کے نخلستان کی قیمت تشخیص کرائی اور وہ ان کو ادا کی۔

فلما اجلاھم عمر بعث معھم من اقام لھم حظھم من الارض والنخل فاداہ الیھم۔ (۹۔ کتاب الاموال)

جب حضرت عمر نے ان کو جلاوطن کیا تو ایک شخص کو بھیجا جس نے ان کے حصّہ کی زمین اور نخلستان کی قیمت تشخیص کی اور آپ نے وہ ادا فرمائی۔

یہاں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ باوجودیکہ ان کی جلاوطنی کا معاملہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں پیش آیا لیکن ان کے ساتھ جو معاہدہ طے پا چکا تھا وہی برقرار رہا اور عام دستور کے مطابق ان کے اوپر کوئی جزیہ عاید نہیں کیا گیا جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جزیہ کا حکم ہر طرح کے غیر مسلموں کے لئے عام نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو جزیہ کا حکم نازل ہونے کے بعد ان پر بھی جزیہ عائد کر دیا جاتا۔

نصاریٰ بنی تغلب کے ساتھ معاہدہ نصاریٰ بنی تغلب نسلاً عرب تھے اور ان کی بہادری اور شجاعت ضرب المثل تھی۔ حضرت عمرؓ نے ان پر جزیہ لگانا چاہا تو انہوں نے اپنی عربی نخوت کی وجہ سے اسکو ناپسند کیا اور ملک چھوڑ کر باہر نکل جانے پر آمادہ ہو گئے۔ عبادہ بن نعمان تغلبی[۱] بیچ میں پڑے اور انہوں نے اس معاملہ میں حضرت عمرؓ سے گفتگو کی۔ انہوں نے کہا "نصاریٰ بنی تغلب کی بہادری آپ کو معلوم ہے، یہ لوگ عین دشمن کے بالمقابل آباد ہیں، اگر انہوں نے آپ کے مخالف ہو کر آپ کے دشمن کا ساتھ دے دیا تو دشمن کا پلہ بھاری ہو جائے گا" اس پر حضرت عمرؓ نے ان پر جزیہ کے بجائے صدقہ عائد کر دیا۔ البتہ اس کی مقدار دگنی کر دی۔ "کتاب الاموال" میں یہ الفاظ ہیں:-

"بنی تغلب عرب ہیں اور جزیہ دینا کسرِ شان سمجھتے ہیں (یانفون من الجزیۃ) اور یہ گلہ والے لوگ نہیں ہیں۔ یہ کھیتی باڑی والے لوگ ہیں اور دشمن پر ان کی بڑی دھونس ہے۔ آپ ان کو ناراض

[۱] ابوعبید نے جو روایت نقل کی ہے اس میں زرعہ بن نعمان یا نعمان بن زرعہ کا نام ہے ابن کثیر کتاب الخراج سے یہ روایت لے رہا ہوں۔

کر کے ان کے ذریعہ سے اپنے دشمنوں کو قوت نہ پہنچائیے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ان پر جزیہ کے بجائے صدقہ مقرر کر دیا۔ البتہ اسکی مقدار اصلی شرعی مقدار سے دوگنی کر دی[1]۔

اس معاہدہ سے دو باتیں بالکل واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں:۔

(۱) ایک یہ کہ اگر غیر مسلموں کی کوئی جماعت (جو مفتوح ذمیوں کی حیثیت نہ رکھتی ہو) جزیہ دینے میں عار محسوس کرے تو اسلامی حکومت اس سے ان کو بری قرار دے سکتی ہے اور اسکی جگہ کوئی ایسی دوسری شکل اختیار کر سکتی ہے جس پر وہ راضی ہوں بشرطیکہ وہ اسلام کے کسی اصول کے خلاف نہ ہو اور بیت المال کو اس سے نقصان نہ پہنچ رہا ہو۔

(۲) دوسری یہ کہ اگر غیر مسلموں کی کوئی جماعت فوجی یا سیاسی یا صنعتی یا کسی اور پہلو سے کوئی خاص اہمیت رکھتی ہو اور اندیشہ ہو کہ اگر ان کو مطمئن نہ کیا گیا تو دشمن ان سے فائدہ اٹھائے گا تو اسلامی حکومت ان کی تالیف قلب کے لئے ان کو ایسی رعائتیں دے سکتی ہے جن سے کتاب وسنت کے کسی اصول کی خلاف ورزی لازم نہ آتی ہو۔

اہل نجران کا معاہدہ اس سلسلہ میں ایک اور قابل ذکر معاہدہ اہل نجران کا ہے۔ ہم پہلے اس کے الفاظ نقل کرتے ہیں۔ اس کے بعد ان احکام کی طرف اشارہ کریں گے جو اس سے نکلتے ہیں:۔

بسم الله الرحمن الرحيم - هذا ما كتب محمد النبي رسول الله لنجران اذا كان عليه حكمه في كل ثمرة وفي كل صفراء وبيضاء وسوداء ورقيق، فافضل عليهم وترك ذالك كله على الفي حلة، في كل رجب الف حلة وفي كل صفر الف وكل حلة اوقية، ما زادت على الخراج او نقصت على الاواقي فبحساب، وما

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یہ معاہدہ محمد رسول اللہ نے اہل نجران کیلئے (اُس وقت) لکھا جبکہ انہیں آنحضرت کو ان کے تمام پیداوار، سیاہ وسفید وزرد اور غلاموں کے بارہ میں ہر فیصلہ کا پورا اختیار تھا مگر انہوں نے ان کے حال پر عنایت کی اور یہ سب چھوڑ کر صرف اس پر قناعت کی کہ وہ صرف دو ہزار حلّے[2] (سالانہ) دیں گے، ایک ہزار رجب کے مہینے میں اور ایک ہزار صفر کے مہینہ میں اور ہر حُلّہ کی

[1] کتاب الخراج صفحہ ۶۰، کتاب الاموال صفحہ ۲۹ - [2] حُلّہ دو یمنی چادروں پر مشتمل ہوتا تھا۔

قضوا من دروع او خیل او رکاب او عرض	کی قیمت ایک اوقیہ[1] محسوب ہوگی
أخذ منهم بحساب - وعلى نجران مثوى	حلّوں میں جو کمی بیشی ہوگی اس کا حساب اوقیہ
رسلي ومتعتهم بها عشرين فدونه و	سے ہوگا۔ جو زرہ یا گھوڑے یا اونٹ یا سامان یہ
لا يحبس رسول فوق شهر وعليهم عارية	دینگے وہ سب ان کے حساب میں منہا ہوگا ــــ
ثلاثين درعا وثلاثين فرسا وثلاثين بعيرا	میرے جو نمائندے نجران جائیں گے بیس روز یا اس
اذا كان كيد باليمن ومعذرة وما هلك مما	سے کم مدت تک ان کی میزبانی نجران کے لوگوں
اعاروا رسولي من درع او خيل او ركاب	کے ذمہ ہوگی۔
فهو ضامن على رسولي حتى يؤديه اليهم	میرے نمائندوں کو خراج کی تحصیل کے سلسلہ
ولنجران وحسبها[2] جوار الله وذمة محمد	میں ایک مہینہ سے زیادہ نہیں روکا جائیگا۔ اگر یمن
النبي على انفسهم وملتهم وارضهم واموالهم	میں کوئی ہنگامی صورت پیدا ہوگی تو تیس زرہیں
وغائبهم وشاهدهم وعشيرتهم و	تیس گھوڑے اور تیس اونٹ بطور عاریت دیں گے۔
تبعهم ــــ وان لا يغير وما كانوا عليه	اور جو سامان جنگ (زرہیں یا گھوڑے یا اونٹ) یہ
ولا يغير حق من حقوقهم ولا ملتهم و	عاریۃً دیں گے اس میں سے جو ضائع ہوگا اس کے
لا يغير اسقف من اسقفيته ولا راهب	ضامن میرے نمائندے ہوں گے۔ اور نجران اور
من رهبانيته ولا واقهة من وقهيته	اس کے متعلقات (Dependence) کے
وكل ما تحت ايديهم من قليل او كثير -	لئے اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ ہے، ان کی جانوں
وليس عليهم ربية ولا دم جاهلية - و	کے لئے، ان کے مالوں کیلئے، ان کی زمینوں کیلئے
لا يحشرون ولا يعشرون	ان کے حاضر و غائب، قوم اور ماتحتوں سب کیلئے۔
ولا يطأ ارضهم جيش ومن سأل منهم حقا[3]	اس وقت ان کی جو حیثیت ہے وہ برقرار رکھی جائیگی۔

[1] ایک اوقیہ چالیس درہم یعنی ہمارے تقریباً دس روپے کے مساوی تھا [2] ابو عبید نے جو روایت نقل کی ہے اس میں "حاشیتھا" کا لفظ ہے اور میرے خیال میں یہی صحیح ہے۔ لیکن اگر اسی لفظ کو صحیح مانا جائے تو غالباً اس سے مراد وہ بستیاں ہیں جو نجران سے تعلق ر

ی ہیں [3] کتاب الاموال میں اس موقعہ پر معاہدہ میں ربا کی بھی تصریح ہے کہ ان کیلئے انصاف حاصل کرنے کا انتظام ان کے اپنے علاقہ نجران ہی میں کیا جاتا

بینهم النصف غیر ظالمین ولا مظلومین ومن اکل ربا من ذی قبل فذمتی منه بریئة ولا یؤخذ منهم رجل بظلم آخر وعلی ما فی هذه الصحیفة جوار الله وذمة محمد النبی رسول الله حتی یاتی الله بامره ما نصحوا واصلحوا فیما علیهم غیر مثقلین بظلم[1]

ان کے کسی حق میں کوئی تغیر نہیں کیا جائیگا اور ان کے مذہب میں دخل اندازی کیجائیگی، نہ ان کے کسی پادری کو اس کے مقام سے ہٹایا جائیگا اور نہ کسی راہب سے کوئی تعرض کیا جائیگا اور نہ کسی صلیب خانے کے کلیدبردار کو اس کے مقام سے ہٹایا جائیگا جو کچھ ان کے قبضہ میں ہے خواہ کم ہے یا زیادہ اس سے بھی کوئی تعرض نہیں کیا جائیگا۔ زمانہ جاہلیت (قبل از تسلط اسلام) کے کسی خون اور کسی اقدام کے بارہ میں اُن سے کوئی مطالبہ نہ ہوگا خراج کی وصولی کے لئے اُن کو جمع ہوکر حاضر ہونے کا حکم نہیں دیا جائیگا (بلکہ ان کے ہاں خود پہنچ کر وصولی کی جائیگی) اور ان سے عشور (چنگی) نہیں لیا جائیگا۔ ان پر کسی فوج کو حملہ آور نہیں ہونے دیا جائے گا۔ اور ان میں سے جو کسی حق کا مدعی ہوگا تو ان کے درمیان بے لاگ انصاف کیا جائیگا۔ لیکن جو کوئی سود کھائیگا تو اسکی ذمہ داری سے ہم بری ہوں۔ اور ان میں سے کسی شخص کو کسی دوسرے کے جرم میں نہیں پکڑا جائیگا۔ اس معاہدہ میں جو باتیں لکھی گئی ہیں ان پر اللہ اور اس کے نبی اور رسول محمد کی ذمہ داری ہے یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ ظاہر ہو اور جب تک یہ حقِ خیرخواہی ادا کرتے رہیں اور اپنی اٹھائی ہوئی ذمہ داریوں کے بارہ میں بغیر کسی زیادتی کے راہِ راست پر رہیں۔

اس معاہدہ میں اہل نجران پر جو ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں :-

(۱) دو ہزار حُلّے[2] سالانہ دو قسطوں میں بطور خراج[3] دیں گے۔

---

[1] یہ معاہدہ میں نے زاد المعاد جلد ۳ صفحہ ۳۵ سے نقل کیا ہے۔ مختلف کتابوں میں اسکی روایت میں جزوی اختلافات ہیں اور بعض چھاپے کی بھی غلطیاں ہیں لیکن قدر مشترک سب میں ایک ہی ہے اس لئے میں نے تصحیح و تنقید کی کاوش ضروری نہیں سمجھی۔ [2] دو ہزار حُلّوں کی قیمت اُس حساب سے جو معاہدہ میں مذکور ہے اس وقت ہمارے سکے میں تقریباً بیس ہزار روپے ہوتے ہیں۔ یہ رقم ایک ایسی آبادی پر ڈالی گئی تھی جو ۷۳ بستیوں میں پھیلی ہوئی تھی اور جس کے اندر صرف لڑنے کے قابل مردوں کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی۔ (زاد المعاد جلد ۳ صفحہ ۵۱) [3] بطور خراج کا لفظ میں نے بالقصد اس لئے لکھا ہے کہ ہمارے فقہا نے اسبات کی تصریح کی ہے کہ اہل نجران پر جزیہ نہیں لگایا گیا تھا (کتاب الخراج صفحہ ۶۹)

(۲) اگر یمن میں کوئی ہنگامی صورت (state of Emergency) پیدا ہو گئی تو تیس گھوڑے، تیس اونٹ اور تیس زرہیں یہ مستعار دیں گے۔ حکومت اس سامان کی ضامن ہوگی اور اس میں سے جو ضائع ہوگا وہ ادا کریگی۔

(۳) حکومت کے تحصیلدار اور دوسرے حکام جو خراج کی تحصیل وغیرہ کے سلسلہ میں نجران جائیں گے بیس روز یا اس سے کم مدت تک ان کی میزبانی اہل نجران کے ذمہ ہوگی[1]۔

(۴) خراج کی ادائیگی تاریخ واجب الادا سے ایک ماہ کے اندر اندر کر دی جایا کرے گی۔

(۵) سودی کاروبار کی انہیں اجازت نہیں ہوگی۔

ان پانچ ذمہ داریوں کے بالمقابل اہل نجران کے لئے اسلامی حکومت نے مندرجہ ذیل حقوق تسلیم کیے:-

(۱) نجران اور اس سے متعلق آبادیوں کے لوگوں کے آزاد و غلام سب کے جان، مال، مذہب اور املاک کے لئے اللہ اور اس کے رسولؐ کا ذمہ ہے۔

(۲) ان کی سابق حیثیت برقرار رکھی جائے گی۔

(۳) ان کے مذہب (Religion including personal Law) میں کوئی تغیر نہیں کیا جائیگا۔

(۴) ان کے مذہبی نظام، مذہبی اداروں اور اوقاف وغیرہ میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔

(۵) زمانہ جاہلیت (قبل از تسلط حکومت اسلامی) کے کسی الزام اور کسی خون کے بارہ میں ان سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔

(۶) خراج کی تحصیل تحصیلدار اُن کے ہاں جا کر کریں گے، انہیں کسی دوسرے علاقے میں حاضر ہو کر اس کی ادائیگی کا حکم نہیں دیا جائے گا۔

(۷) ان سے چنگی نہیں وصول کی جائے گی۔

(۸) بیرونی حملہ آوروں سے ان کی حفاظت کی جائے گی۔

(۹) ان کے مقدمات اور جھگڑوں کو طے کرنے کے لئے ان کے علاقہ کے اندر عدالتی نظام قائم کیا جائیگا۔

(۱۰) کوئی شخص کسی دوسرے کے جرم میں گرفتار نہیں کیا جائے گا۔

---

[1] یہ شرط اُس زمانہ میں اس لیئے ضروری تھی کہ یہ آبادیاں مرکز دارالاسلام سے دور تھیں اور ان کے اندر نہ تو مسلمان آباد تھے کہ مسلمان عمال کی میزبانی کا بار ان پر ڈالا جاتا اور نہ ابھی سرکاری اہلکاروں کے ٹھہرنے کیلئے ڈاک بنگلے وجود میں آئے تھے۔

ایک شبہ اور اس کا جواب علامہ ابن قیم رحمہ اللہ علیہ نے اہل نجران کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ضمناً اہل صلح اور دارالاسلام کی دوسری غیر مسلم رعایا کے فرق کی طرف بھی اشارہ کیا ہے وہ کہتے ہیں:۔

"ان دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ اہل نجران کے درمیان کوئی مسلمان نہ تھا اور اہل صلح تھے اور باقی رہا یمن تو یہ دارالاسلام تھا اور اس میں یہودی بھی تھے اس وجہ سے وہاں کے متعلق حکم دیا کہ وہاں کے افراد پر جزیہ لگایا جائے اور فقہا جزیہ کو اسی طرح کے غیر مسلموں کے لئے خاص کرتے ہیں نہ کہ پہلی قسم کے لوگوں کے لئے لیکن ہمارے نزدیک یہ دونوں (ہی) جزیہ ہیں کیونکہ یہ بھی وہ مال ہے جو غیر مسلموں سے حاکمانہ وصول کیا جاتا ہے۔"[1]

علامہ ابن قیم کی اس عبارت سے شبہ ہوتا ہے کہ وہ عام فقہا کے خلاف اہل صلح اور دارالاسلام کی دوسری غیر مسلم رعایا میں فرق محض اتفاقی سمجھتے ہیں، دونوں میں کوئی اصولی فرق نہیں سمجھتے۔ انکے خیال میں اہل نجران چونکہ دارالاسلام کی عام آبادی سے الگ تھلگ تھے اور انکی علیحدگی کی وجہ سے انکے ساتھ خاص مراعات کا معاملہ کرنے میں چنداں انتظامی زحمت نہیں تھی اس وجہ سے انکے ساتھ ایک خاص طرز کا معاملہ کر لیا گیا ورنہ ہیں یہ بھی دراصل اہل جزیہ ہی۔ انکی اور دوسروں کی قانونی حیثیت میں کوئی فرق نہیں۔ مجھے علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس خیال سے اختلاف ہے۔ میرے نزدیک اس معاملہ میں ان فقہاء کا خیال زیادہ صحیح اور مدلل ہے جو ان دونوں میں فرق ان کے اہل صلح اور اہل عنوہ (مفتوح رعایا) ہونے کی بنا پر کرتے ہیں کیونکہ اگر یہ فرق محض اتفاقی اور مکانی نوعیت کا ہوتا تو اسکی وجہ سے اسلامی حکومت کے سلوک میں زیادہ سے زیادہ صرف انتظامی نوعیت کا فرق ہو سکتا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ دونوں کے حقوق میں بالکل بنیادی اور اصولی قسم کا فرق واقع ہو جائے۔

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کو اصرار ہے کہ اہل نجران پر جو خراج لگایا گیا تھا وہ بھی وہی جزیہ تھا جو اسلامی حکومت غیر مسلم رعایا سے حاکمانہ وصول کرتی ہے۔ لیکن اگر یہ بات صحیح ہے تو بنی تغلب کے بارہ میں کیا کہا جائے گا جن کو حضرت عمرؓ نے جزیہ سے بری ہی اس وجہ سے کیا تھا کہ وہ جزیہ ادا کرنے میں اپنی ہتک سمجھتے تھے اور اور اسباب پر مصر تھے کہ ان سے مسلمانوں کی طرح صدقات وصول کیے جائیں اگرچہ انکی مقدار زیادہ کر دی جائے۔

[1] زاد المعاد۔ جلد ۳ صفحہ ۲۰۵ ۔ یہ ضرور ہے کہ عام استعمال میں اس چیز کو بھی جزیہ کے لفظ سے تعبیر کر دیا گیا ہے لیکن اسے محض جزیہ کا نام دیدینے کی وجہ سے ہم اس فرق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو اس خراج میں اور عام جزیہ میں قانونی اور عرفی حیثیت سے ہے۔

علاوہ ازیں اہلِ صلح اور عام اہلِ ذمہ میں ایک نمایاں فرق یہ بھی ہے کہ اہلِ ذمہ اپنی زمینوں پر محض موروثی کاشتکاروں کی حیثیت سے قابض ہوتے ہیں اور اہلِ صلح کیلئے ہم خود ان معاہدات میں دیکھتے ہیں کہ ان کی زمینوں پر ان کا قبضہ مالکانہ حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔ اہلِ فدک کے معاہدہ میں اس بات کی تصریح ہے کہ وہ اپنی آدھی زمین اور اپنے آدھے نخلستان کے بدستور مالک رہیں گے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اُن کو وہاں سے جب ہٹایا تو ان کو ان کے حصّہ کی زمین اور نخلستان کی پوری پوری قیمت ادا کی۔ اسی طرح اہلِ نجران کے معاہدہ میں بھی تصریح ہے کہ ان کی زمین ان کے لئے محفوظ رہے گی۔ چنانچہ یہی نہیں کہ ان سے عام اہلِ ذمہ کی طرح زمین کا کوئی خراج نہیں وصول کیا گیا بلکہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ان لوگوں نے جب اپنے معاہدہ کو توڑ دیا اور انہوں نے ان کو شام اور عراق میں منتقل کیا تو اپنے عراق اور شام کے گورنروں کو احکام بھیجے کہ ان لوگوں کو ان کی زمین میں چھوڑی ہوئی زمینوں کے بدلہ میں قابلِ زراعت زمینیں دی جائیں، اُن زمینوں پر ان کے بسنے کے دو سال بعد تک ان سے کوئی خراج وغیرہ وصول نہ کیا جائے اور اس کے بعد یہ خراج ہی چیز سے وصول کیا جائے جو یہ پیدا کریں[1]۔

اسی وجہ سے بعض فقہا نے تصریح کی ہے کہ :۔

انّ اهل العنوة فانّ ارضهم وما لهم للمسلمين لانّ اهل العنوة قد غُلِبوا على بلادهم وصارت فيئاً للمسلمين و امّا اهل الصلح فانّهم منعوا بلادهم وانفسهم حتّى صولحوا عليها فليس عليهم الّا ما صولحوا عليه[2]	وہ لوگ جو بزورِ شمشیر مفتوح ہوتے انکی زمین اور ان کا مال مسلمانوں کی ملکیت ہے کیونکہ ان کی زمین ان کے قبضے سے نکل چکی ہے اور مسلمانوں کے لیئے فے بن چکی ہے۔ رہے اہلِ صلح تو انہوں نے اپنی زمین اور اپنی جانوں کی مدافعت کی یہاں تک کہ ان سے ان کے بارے میں مصالحت

ہوگئی اس وجہ سے ان کے ساتھ ان شرائط کے مطابق معاملہ کیا جائیگا جو اُن سے طے پا چکی ہیں۔"

---

[1] کتاب الخراج، قاضی ابویوسف صفحہ ۴۱۔ یہ جان لینا بھی فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ ان لوگوں نے نہ صرف معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سودی لین دین شروع کر دیا تھا بلکہ اسلحہ جنگ کی فراہمی کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ اس پر بھی انہیں ملک بدر کرنے کے بجائے صرف یہ کیا گیا کہ وسط دار الاسلام سے ان کو مملکت کے سرحدی علاقہ میں منتقل کر دیا گیا تاکہ کسی نازک موقعہ پر اندرونی خلفشار سے کوئی بڑا فساد نہ برپا کر سکیں۔ [2] کتاب الاموال، ابو عبید صفحہ ۲۰۱۔

اہل صلح اور اہل عنوہ کے اس فرق کی وجہ سے ایک مسلمان کے لئے یہ بات تو جائز سمجھی جاتی ہے کہ وہ اہل صلح میں سے کسی شخص کی زمین خرید لے لیکن اگر کوئی مسلمان کسی ذمی سے خراجی زمین خریدے تو اسکو بہت سے فقہا ناجائز کہتے ہیں اہل صلح چونکہ اپنی زمینوں کے مالک ہوتے ہیں اس لئے اگر ان سے کوئی مسلمان زمین خریدتا ہے تو وہ گویا اس زمین کے جائز مالک سے اسکو خریدتا ہے۔ اس کے برعکس اہل ذمہ کی زمینوں کے اصلی مالک مسلمان من حیث الجماعت ہیں اور ان زمینوں کی قانونی حیثیت وقف کی زمینوں کی ہے جن پر ذمیوں کا قبضہ محض موروثی کاشتکاروں کی حیثیت سے ہوتا ہے اس وجہ سے اہل ذمہ خود آپس میں تو ان زمینوں کی خرید و فروخت کر سکتے ہیں لیکن کسی مسلمان کے لئے ان کا خریدنا درست نہیں ہے۔ اور اگر کوئی مسلمان خرید لے گا تو وہ زمین بہر حال خراجی ہی رہے گی کسی مسلمان کے قبضہ میں آجانے کی وجہ سے اسکی حیثیت عشری زمین کی نہیں ہو جائے گی۔

اس کے علاوہ اہل صلح سے اگر معاہدہ میں ان کی زمینوں پر کوئی خراج طے پایا ہے تو جو خراج معاہدہ میں طے پایا ہے اس میں حالات کے تقاضے[۱] سے معاہدہ کی مقررہ مقدار خراج میں کمی تو کی جاسکتی[۲] ہے لیکن اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا اگرچہ اس دوران میں زمین کی حیثیت کچھ سے کچھ ہو گئی ہو۔ لیکن یہ امتیاز عام اہل ذمہ کو حاصل نہیں ہے۔ ان کی زمینوں کے خراج میں حالات کے لحاظ سے حکومت کو رد و بدل کرنے کا پورا اختیار ہے۔

اہل نجران کے معاہدہ پر غور کرنے سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ مذہبی، تہذیبی اور اجتماعی معاملات میں بھی ان لوگوں کو بڑی وسیع حد تک آزادی دی گئی ہے۔ اگرچہ اس معاملہ میں عام اہل ذمہ پر بھی جیسا کہ آگے چل کر واضح ہو گا، کوئی خاص قدغن نہیں ہے لیکن اہل صلح کے متعلق تو یہ بات بطور اصول کے تسلیم کر لی گئی ہے کہ از روئے معاہدہ ان کے لئے جو مذہبی اور تہذیبی آزادیاں تسلیم کی گئی ہیں ان کے علاقہ کے اندر ان میں کوئی

---

[۱] مثلاً یہ کہ زمین کی حیثیت کسی وجہ سے کم ہو گئی یا کوئی دوسری معقول وجہ [۲] کتاب الاموال، ابو عبید صفحہ ۱۴۴ [۳] کتاب الاموال ابو عبید صفحہ ۵۰۵۔ اس بارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی موجود ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک فیصلہ بھی موجود ہے۔

مداخلت نہیں کی جائے گی۔

واما البلاد التی لھم فیھا التسبیل الی ذلک فما کان منھا صلحا صولحوا علیہ فلن ینتزع منھم۔[1]

باقی رہے وہ شہر جن میں ان کو اپنے مذہبی مراسم کے علی الاعلان ادا کرنے کا حق ہے تو وہ وہ ہیں جو صلح کے ذریعہ سے فتح ہوئے ہیں۔ جو باتیں ان کے لئے صلح میں تسلیم کی گئی ہیں وہ ان سے واپس نہ لی جائیں گی۔

حضرت عمرؓ اپنے سفر شام کے سلسلہ میں جب اذرعات پہنچے تو وہاں کے باشندے مذہبی اور قومی رسوم کی نمائش کے ساتھ ان کے خیر مقدم کو نکلے۔ حضرت عمرؓ نے دیکھا تو ابو عبیدہؓ سے کہا، ان لوگوں کو اس چیز سے روکو اور ان کو واپس کر دو۔ ابو عبیدہؓ نے کہا، امیر المومنین، یہ تو اہل عجم کا طریقہ ہے، اگر آپ اس چیز سے ان کو روکیں گے تو یہ بدگمان ہوں گے کہ معاہدہ میں آپ نے ان کے لئے جو مذہبی اور تہذیبی آزادی تسلیم کی ہے اسکو واپس لینا چاہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اس پر دلچسپ انداز میں فرمایا، اچھا بھائی، اگر یہ بات ہے تو رہنے دو، اس وقت عمر اور آل عمر ابو عبیدہ کے اختیار میں ہیں۔[2]

اسی طرح اہل صلح کے متعلق یہ اصول بھی تسلیم شدہ ہے کہ ان کو یا ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام نہیں بنایا جا سکتا۔ اگرچہ اسلامی حکومت کا یہی طرز عمل بزور شمشیر فتح کیے ہوئے لوگوں کے ساتھ بھی عام طور پر رہا ہے لیکن یہ حکومت کا احسان ہے، ان کا کوئی قانونی حق نہیں ہے۔[3] لیکن اہل صلح کے بارہ میں یہ قانون ہے کہ ان کو نہ تو قتل کیا جا سکتا ہے اور نہ ان کو غلام بنایا جا سکتا ہے بلکہ وہ آزاد ہونگے۔

وسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والمسلمین ان لا یسباء علی اھل الصلح ولا یرق وانھم احرار۔[4]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ اہل صلح لونڈی غلام نہیں بنائے جا سکتے وہ آزاد ہیں۔

---

[1] کتاب الاموال، ابو عبیدہ صفحہ ۱۰۰ [2] کتاب الاموال، ابو عبید صفحہ ۱۴۲ [3] ایسے لوگوں کے ساتھ قانون کی رو سے مختلف صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں مثلاً ان سے (Ransome) وصول کیا جا سکتا ہے، انکو غلام بنایا جا سکتا ہے، ان کے خاص خاص مفسد سرغنوں کو قتل بھی کیا جا سکتا ہے [4] کتاب الاموال، ابو عبیدہ صفحہ ۱۸۳

نقض عہد اور اس کے شرائط و حالات

اس سلسلہ میں مختصراً یہ واضح کر دینا بھی فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ جہاں تک اسلامی حکومت کا تعلق ہے اس کے نزدیک اس طرح کے کسی معاہدہ کی حیثیت محض وہ نہیں ہے جو اس زمانہ میں عام طور پر ایک معاہدہ کی سمجھی جاتی ہے کہ جب چاہا کسی معمولی سی بات کو بہانہ بنا کر اسکو توڑ دیا۔ اسلامی حکومت اس طرح کے جو معاہدات کرتی ہے اُن کے لیئے وہ خدا اور رسول کو ذمہ دار ٹھہراتی ہے۔ اس وجہ سے اگر وہ کسی عذر معقول کے بغیر کسی معاہدے کو توڑ دے تو اس سے صرف ریاست کی عزت ہی خاک میں نہیں ملتی بلکہ ان تمام مسلمانوں کا دین و ایمان بھی خطرہ میں پڑ جاتا ہے جن کی حکومت نقض عہد کا ارتکاب کرتی ہے۔ اس وجہ سے اول تو خود اسلامی حکومت ان معاہدات کی عظمت و اہمیت کو ملحوظ رکھتی ہے لیکن اگر خدانخواستہ اس سے معاملہ میں کوئی کوتاہی صادر ہو جائے تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے اور اپنی حکومت کو خدا اور رسول کے ذمہ کی توہین کرنے کی اجازت نہ دے۔ یہاں ہم اسلام کی ابتدائی تاریخ سے بعض واقعات پیش کرتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوگا کہ اسلامی حکومت جب ایک مرتبہ اللہ و رسول کے نام پر کسی جماعت کو اسکی حفاظت کی ضمانت دے دیتی ہے تو کس حد تک اسکو نباہتی ہے کس طرح کے حالات میں وہ اپنے آپ کو اس سے بری الذمہ سمجھتی ہے۔ نیز ان سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ کسی معاہدہ کو کالعدم قرار دینے کے لئے کیا شرائط و حالات ضروری ہیں اور اگر کبھی حکومت نے ان شرائط و حالات کو ملحوظ رکھنے میں کوئی کوتاہی کی ہے تو کس طرح مسلمان علماء اور فقہا اپنی حکومت کے سر ہو گئے ہیں۔

اہل عربسوس کا نقض عہد

حضرت عمرؓ نے عمیر بن سعید (یا سعد) کو شام کے علاقہ کا گورنر مقرر کیا۔ کچھ دنوں کے بعد ایک روز وہ دفعۃً حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ اطلاع دی کہ ہمارے اور رومیوں کے درمیان ایک شہر ہے جس کا نام "عربسوس" ہے۔ یہ لوگ ہمارے معاہد ہیں لیکن ان کا حال یہ ہے کہ یہ ہمارے سارے حالات سے تو دشمن کو باخبر کرتے رہتے ہیں لیکن ہم کو اُس کے کسی راز کا پتہ نہیں دیتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ان کے سامنے دو متبادل صورتیں رکھ دو۔ ایک یہ کہ یہ اپنی

ہر بکری کی جگہ دو بکریاں، ہر اونٹ کی جگہ دو اونٹ اور اپنی ہر چیز کی جگہ دو چیزیں ہم سے لے لیں اور ہمارے ملک سے نکل جائیں۔ اگر وہ اسکو منظور کر لیں تو ان کو نکال دو اور شہر کو برباد کر دو۔ اور اگر وہ اس پر راضی نہ ہوں تو پھر دوسری صورت یہ ہے کہ معاہدے کے خاتمہ کا اعلان کر کے ان کو ایک سال کی مہلت دو اور اس کے بعد ان کو نکال دو۔ عمیر نے ان لوگوں کے سامنے یہ دونوں صورتیں رکھ دیں وہ پہلی صورت پر راضی نہیں ہوئے اس وجہ سے انہوں نے ایک سال کی مہلت دینے کے بعد ان کو وہاں سے جلاوطن کر دیا۔[1]

اہل جبل اللبنان کا نقض عہد اسی سے ملتا جلتا واقعہ شام کے ایک مقام جبل اللبنان کا ہے جو بنی عباس کے ابتدائی زمانہ میں پیش آیا۔ یہ لوگ بھی اہل الصلح کی حیثیت رکھتے تھے لیکن انہوں نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی جس کی بنا پر اس زمانہ کے والئ شام، صالح بن علی نے ان کو جلاوطن کر دیا۔ یہ واقعہ امام اوزاعی کے زمانہ میں پیش آیا جن کی عظمت اور جلالت مرتبہ سے اسلامی تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے۔ انہوں نے گورنر کے اس فعل کو حدود شرع سے کچھ ہٹا ہوا پایا اور عباسی خلیفہ کے نام ایک طویل مراسلہ میں اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ ہم ان کے خط کا کچھ حصہ ذیل میں درج کرتے ہیں جس سے ایک طرف تو یہ اندازہ ہوگا کہ اہل صلح کے خلاف کوئی اقدام کرنے کے لئے کیا احتیاطیں ضروری ہیں، دوسری طرف ایک اسلامی حکومت کے اندر علماء اور ائمہ اسلام کا اصلی مقام معلوم ہوگا کہ وہ اپنی حکومت کی غلطیوں پر کس طرح اسکو ٹوکتے تھے اور غیر مسلموں کے حقوق کی حفاظت کے لئے کیسی منصفانہ نگاہ اور کیسی زبردست اخلاقی جرأت رکھتے تھے:۔

امام اوزاعی اپنے اُس مراسلہ میں فرماتے ہیں:۔

جبل اللبنان سے جن بنا پر اہل ذمہ کو نکالا گیا ہے اس جرم میں ان کے سارے لوگ شریک نہ تھے۔ ان میں سے جنہوں نے بغاوت کی انہوں نے کی۔ پوری قوم نے بغاوت میں شرکت نہیں کی۔ اس وجہ سے ان میں سے جو مجرم ہیں ان کو سزا دو اور باقی بے گناہوں کو ان

[1] کتاب الاموال، ابو عبید، صفحہ ۱۸۳

کی بستیوں میں واپس کرو۔ یہ کونسا قاعدہ ہے کہ چند آدمیوں کے جرم میں پوری قوم پکڑ لی جائے اور ان کو ان کے گھروں اور ان کی جائدادوں سے نکالا جائے! اللہ تعالیٰ کا قانون تو ہمیں یہ بتاتا ہے کہ وہ چند خاص لوگوں کے جرم میں عام لوگوں کو نہیں پکڑا کرتا بلکہ عام لوگوں کے جرم میں خواص کو پکڑتا ہے پھر ان کے سب کے ساتھ ان کے اعمال کے مطابق معاملہ کرتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کی بات سب سے زیادہ پیروی اور اطاعت کے لائق ہے اور پھر سب سے زیادہ حفاظت کے لائق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ "جس نے کسی معاہد پر ظلم کیا یا اس پر اسکی برداشت سے زیادہ بار ڈالا تو میں قیامت کے دن خود اس سے جھگڑنے والا ہوں گا" جن کی جان کے احترام کی ذمہ داری لی گئی ہے ان کا مال بھی اسی طرح محترم ہے اور اس کے بارہ میں بھی ان کے ساتھ پورا انصاف کیا جائے گا۔ یہ تمہارے غلام نہیں ہیں کہ تم ان کو وہاں سے یہاں اور یہاں سے وہاں پھینکتے پھرو۔ یہ آزاد اہل ذمہ ہیں۔ ان کا شادی شدہ اگر زنا کا مرتکب ہوگا تو اسکو سنگسار کیا جائیگا اور اگر ان کی عورتوں میں سے کسی عورت سے ہمارا کوئی آدمی نکاح کرے گا تو باریوں کی تقسیم طلاق اور عدت وغیرہ کے معاملات میں وہ عورت بالکل ہماری عورتوں کی ہمسری کریگی[1]

اہل قبرص کا معاملہ ان واقعات کے بعد اہل قبرص کی بدعہدی کا معاملہ پیش آیا۔ یہ لوگ بیک وقت دو حکومتوں کے باجگزار اور دونوں کی وفاداری کے مدعی تھے۔ ایک طرف امیر معاویہ کے زمانہ میں ایک مقررہ مقدار خراج پر انہوں نے معاہدہ کیا تھا اور دوسری طرف یہ رومیوں کو بھی خراج دیتے تھے اس وجہ سے ان لوگوں کی وفاداری تقسیم ہوگئی تھی اور اس تقسیم ہی کی وجہ سے ان لوگوں کا رویہ ہمیشہ مشتبہ اور مشکوک رہا۔ تاہم مسلمان گورنروں نے معاہدہ کا احترام برابر قائم رکھا۔ عباسیوں کے زمانہ میں عبد الملک بن صالح[2] سرحدی علاقوں کا گورنر مقرر ہوا۔ اُس کے زمانہ میں بھی ان لوگوں نے کوئی غداری کی جس کی وجہ سے اسکو ان کے خلاف

[1] کتاب الاموال، ابوعبید، صفحہ ۱۷۰-۱۷۱ [2] رشید اور امین کے بہترین سپہ سالاروں میں سے تھا۔ سنہ ۱۹۶ھ میں وفات پائی۔

کارروائی کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ لیکن چونکہ معاملہ اہل صلح کا تھا اس وجہ سے اس نے تنہا اپنی صوابدید پر کوئی قدم اٹھانا مناسب خیال نہیں کیا بلکہ ساری صورتِ حال وقت کے تمام بڑے بڑے علماء اور فقہا کے سامنے رکھ کر اس معاملہ میں ان کی رائے دریافت کی۔ جن لوگوں کو اس نے خطوط لکھے اور انہوں نے جواب دیئے ان میں مندرجہ ذیل حضرات کے نام کتابوں میں ملتے ہیں:۔

لیث بن سعد۔ مالک بن انس۔ سفیان بن عُیَینہ۔ موسٰے بن اَعین۔ اسمٰعیل بن عیاش۔ یحییٰ بن حمزہ ابواسحٰق فزاری۔ مخلد بن حسین۔

اسلامی تاریخ کا ہر طالب علم ان ناموں پر نظر ڈال کر اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ حضرات اس پایہ کے لوگ ہیں کہ صرف اپنے زمانہ ہی میں پیشوا نہیں تھے بلکہ ان میں سے اکثر نے اپنی عظمت کی یادگاریں اپنے اخلاف کے لئے بھی ورثہ میں چھوڑی ہیں۔ ان کے جوابات تفصیل کے ساتھ نقل کرنے میں طوالت ہوگی لیکن میں بعض جوابات کے کچھ حصے یہاں نقل کروں گا تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ اہل صلح کا کوئی گروہ اگر نقضِ عہد کا مرتکب ہوگا تو اسلامی حکومت شریعت کے حدود کے اندر رہتے ہوئے اس کے ساتھ کیا کارروائی کر سکتی ہے

لیث بن سعد نے جواب میں لکھا:۔

"اہل قبرس کے متعلق برابر یہ شکایت رہی ہے کہ مسلمانوں کے بدخواہ اور رومیوں کے خیرخواہ ہیں اس وجہ سے (قرآن کی بعض آیات کا حوالہ دیتے ہوئے) میرا یہ خیال ہے کہ ان کا معاہدہ ختم کر دیا جائے اور ان کو ایک سال کی مہلت دی جائے۔ اس دوران میں وہ سوچ کر فیصلہ کر لیں جو شخص ادائے خراج اور ہماری ذمہ داری کے اعتماد پر ہمارے ملک میں آنا چاہے وہ ہمارے ملک میں آ جائے، جو رومیوں کے پاس جانا چاہیں وہاں چلے جائیں اور جو شخص قبرس میں ٹھہر کر ہم سے جنگ کرنا چاہے اس سے جنگ کی جائے۔ ایک سال کی مہلت دینے کے بعد ان کے لئے کوئی عذر باقی نہیں رہ جائے گا اور ہماری طرف سے معاہدہ کا حق پورا ہو جائیگا۔"

سفیان بن عیینہ نے اپنے طویل جواب کے آخر میں لکھا:۔

"جس شخص نے اپنے کیئے ہوئے معاہدے کو توڑ دیا ہے اور اسکی قوم نے اس معاملہ میں اس کا ساتھ دیا تو پھر ان کا ذمہ باقی نہیں رہ جاتا۔"

حضرت مالک بن انس نے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے کہ بغیر اتمام حجت کیئے اُن کے معاہدہ کو ختم کرنے میں جلدی نہ کرو..... اگر تنبیہ اور اتمام حجت کے بعد بھی وہ سیدھے نہ ہوں [illegible] سے باز نہ آئیں اور تم اچھی طرح تحقیق کر لو کہ فی الحقیقت عہد شکنی انہی کی طرف سے ہوئی ہے تو پھر تم ان کے خلاف کارروائی کرنے میں آزاد ہو۔ اس صورت میں تمہارا پہلو قوی ہوگا، اللہ تمہاری مدد کرے گا اور وہ رُسوا ہوں گے۔"

موسٰے بن اعین کا جواب یہ تھا کہ :-

"اس طرح کی شکائیتیں برابر ہوتی رہی ہیں اور حکام ان کا تدارک کرتے رہے ہیں۔ ان باتوں کی وجہ سے کسی نے اہل قبرس کے معاہدہ پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ ممکن ہے جو بات علم میں آئی ہے وہ ان کے صرف افراد کی کارستانی ہو، ان کی قوم اس میں شریک نہ ہو۔ اس وجہ سے میرا خیال یہی ہے کہ ان کے ساتھ معاہدہ باقی رکھا جائے۔"

اسمٰعیل بن عیاش نے جواب میں لکھا :-

"قبرس کے لوگ بیچارے دبے ہوئے اور مظلوم ہیں۔ رومی ان کی جانوں اور ان کی عورتوں کے مالک بنے ہوئے ہیں۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم ان لوگوں کی حفاظت اور ان کی حمایت کریں۔ (تمہیں معلوم ہے کہ) حبیب بن مسلمہ (گورنر آرمینیہ) نے آرمینیہ والوں سے جو معاہدہ کیا تھا اُس میں اُس نے اُن کو یہ بھی اطمینان دلایا تھا کہ اگر ہم کسی مشکل میں پڑ جانے کی وجہ سے تمہاری خبر گیری نہ کر سکے اور دشمن نے تم کو بے بس کر دیا تو اس کے باوجود ہمارے ساتھ تمہارا عہد اس وقت تک نہیں ٹوٹے گا جب تک تم ہمارے ساتھ وفاداری کے ارادہ پر استوار ہو گے۔ اس نظیر کے پیش نظر اہل قبرس کی رومیوں کے مقابلہ میں بے بسی کو سامنے رکھتے ہوئے

میرا خیال یہ ہے کہ ان کے عہد اور ذمہ کو بھی قائم رکھا جائے۔ (مزید برآں تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ) ولید بن یزید نے اپنے زمانہ میں ان لوگوں کو شام کی طرف جلا وطن کر دیا تھا جس کو تمام علماء نے بہت برا مانا تھا۔ چنانچہ پھر (ولید کے بیٹے) یزید بن ولید نے اپنے زمانہ میں ان کو (واپس لاکر) ان کے گھروں میں دوبارہ بسایا جس پر مسلمانوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا کہ عدل کا حق پورا ہوا۔"

ابو اسحٰق اور مخلد بن حسین دونوں حضرات نے اس معاملہ میں اپنی رائے کے ساتھ امام اوزاعی کی یہ رائے بھی تائید اً نقل کی :-

"اہل قبرس نے کبھی ہمارے ساتھ وفاداری نہیں کی لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ لوگ ہمارے معاہد ہیں۔ ان سے کچھ شرائط پر ہماری صلح ہو چکی ہے۔ اس عہد کو اس وقت تک توڑنا جائز نہیں ہے جب تک انکی طرف سے کوئی ایسی بات نہ ہو جو ان کے نقض عہد کو پوری طرح آشکارا کر دے۔"[1]

یہ جوابات کسی تبصرے کے محتاج نہیں ہیں[2]۔ ان سے حسب ذیل باتیں بطور اصول اور قواعد کلیہ کے واضح ہوتی ہیں :-

(۱) اسلامی حکومت اپنے معاہدات پر آخری حد تک قائم رہنے کی کوشش کریگی (۲) اگر کسی معاہد جماعت کے متعلق یہ بات علم میں آئے کہ انہوں نے معاہدہ کی کوئی خلاف ورزی کی ہے تو اس امر کی تحقیق کیجائیگی کہ یہ خلاف ورزی محض ان کے چند افراد کا انفرادی فعل ہے یا پوری جماعت کی رضا اور تائید اس کے ساتھ شامل

---

[1] یہ ساری تفصیل میں نے ابو عبید کی "کتاب الاموال" صفحہ ۱۶۹ - ۱۷۱ سے لی ہے۔

[2] آجکل کے "حامیانِ اسلام" تو شاید اس بات پر حیران ہی رہ جائیں گے کہ جن "مولویوں" نے غیر مسلموں کی حمایت میں یہ کچھ لکھ دیا تھا، ان پر اس زمانہ میں سیفٹی ایکٹ کیوں نہ لگایا گیا اور وہ غدار قوم اور دشمنوں کے ایجنٹ کیوں نہ قرار دیئے گئے۔ لیکن دراصل یہ اُس زمانہ کی باتیں ہیں جب مسلمانوں میں علم اور اخلاق دونوں چیزیں پائی جاتی تھیں اور وہ "اوصاف حمیدہ" پیدا ہونے میں کئی صدی کی دیر تھی جن سے موجودہ دور کے خادمانِ دین متین آراستہ ہو کر اُٹھے ہیں۔ (ناشر)

ہے۔ اگر پہلی صورت ہے تو صرف ان افراد کے خلاف کارروائی کیجائیگی جنہوں نے شرارت کی ہے اور اگر تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو کہ اس شرارت کی پشت پر پوری جماعت کا ہاتھ ہے تو اس صورت میں ان کو اصلاح حال اور اتمام حجت کے لئے ایک مناسب مہلت دی جائیگی۔ اگر انہوں نے اپنے رویہ میں اصلاح کرلی تو خیر، ورنہ حکومت ان کے خلاف مناسب اقدام کیلئے آزاد ہے۔ (۳) اسمٰعیل بن عیاش کے جواب سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ اگر اہل عہد کسی بیرونی دباؤ سے مجبور ہو کر معاہدہ کی خلاف ورزی کریں تو اس صورت میں وہ سزا کے بجائے حمایت کے مستحق ہیں تاکہ اس بیرونی دباؤ کا مقابلہ کر سکیں۔

(باقی)

ماہنامہ "زندگی"

۱۔ قرآن کی تفسیر اس طرح کرتا ہے کہ دلائل و براہین کی روشنی میں ایمان تازہ اور عملی ولولہ بیدار ہوتا ہے۔

۲۔ دین حق کی خالص اور بنیادی تعلیمات عام کرتا ہے۔

۳۔ اسلام کے تقاضوں کو واضح کرتا اور انہیں پورا کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

۴۔ حالاتِ حاضرہ پر معیاری اور بلند پایہ مقالات پیش کرتا ہے۔

۵۔ مسلمانوں کے سامنے صحیح اسلامی راہِ عمل واضح کرتا ہے۔

۶۔ دنیا کی گتھیوں کا عموماً اور مسلمانوں کی موجودہ مشکلات کا خصوصاً صحیح قابلِ عمل اور یقینی حل پیش کرتا ہے۔

نمونہ طلب فرما کر ملاحظہ فرمائیے انشاء اللہ آپ اسے اِن خوبیوں سے آراستہ پائیں گے۔ سالانہ چندہ صہ فی پرچہ ۸ر۔ ۵ پرچوں پر ایجنسی کمیشن ۲۵ فیصدی۔ نمونہ مفت۔

نوٹ:۔ پاکستانی اصحاب خریداری و ایجنسی کے لئے دفتر "کوثر" نزد تھانہ گوالمنڈی لاہور میں "زندگی" کے حساب میں رقوم جمع کردیں اور ہمیں مطلع فرما دیں۔ منیجر "زندگی" رام پور۔ یو۔پی۔